مولانا صلاح الدین احمد اور اقبالیات

IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

ڈاکٹر انور سدید

"اقبال کی تعلیمات کی بُنیاد تہذیب و تربیتِ انسانی کا اسلامی تصوّر ہے مگر یہ اس کی وسیع تر بُنیاد ہے۔ اس پر اقبال کے فکر نے ایک بے مثال عمارت تعمیر کی جس کی رفعت آج اقصائے عالم کی تعمیرات پر خندہ زن ہے۔"

(مولانا صلاح الدین احمد)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی زندگی میں علامہ اقبالؒ اور فکرِ اقبال کو ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اقبالؒ ان کے لئے محض ایک شاعر نہیں تھے بلکہ وہ مسلمان قوم کے راہنما، مستقبل شناس اور پیغمبرِ فکر و نظر بھی تھے اور مولانا صلاح الدین احمد نے ان کا محض مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ ان سے فیضان بھی حاصل کیا۔ مولانا نے مذہب، سیاست اور ثقافت کے موضوعات کو جب کبھی زدِ قلم میں لیا تو ان موضوعات کو فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں گرہ کشا کرنے کی طرح ڈالی اور پاکستانی قوم کو خطاب کیا تو قلوبِ مردہ کو اعجازِ اقبال سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی؛ چنانچہ انہوں نے اس ایقان کا اظہار کیا ہے کہ:

"اسلامیانِ ہند کے لئے علامہ کا کلام عین وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک گم کردہ راہ قوم کے ہادی کے پیام کو ہمیشہ سے حاصل رہی ہے[۱] ------ اساتذۂ سلف نے جس شاعری کو پیغمبری قرار دیا تھا۔ ہماری صدی اور ہمارے ملک میں اگر اس کا اطلاق کسی شاعری پر ہوتا ہے تو وہ لاریب حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی شاعری ہے، اور اقبال کی شاعری کا پیغامی عنصر ہی اس کی روح ہے"[۲]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

"ادب کی طرح اقبالیات کا موضوع بھی ان مولانا صلاح الدین احمد کا محبوب و مرغوب مضمونِ مطالعہ تھا۔------ اور یہ راز کھلتا ہے کہ صلاح الدین احمد کا مطالعۂ اقبال کتنا وسیع اور غائر تھا، وہ کس طرح کلامِ اقبالؒ کی باریکیوں کی معرفت رکھتے تھے اور انہیں اس امر پر پوری قدرت حاصل تھی کہ کسی مسئلۂ خاص پر اقبالؒ کے پورے کلام سے استشہاد کر سکیں"[۳]

All rights reserved

چنانچہ اقبالیات کے سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد کے مطالعے کی اس خاص جہت کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ انہوں نے حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیوں کو دریافت کرنے یا ملفوظاتِ اقبال جمع کرنے یا اقبال سے اپنی ملاقاتوں کو بازیافت کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ انہوں نے محفلِ اقبال میں بیٹھنے والا سے اپنی نیازمندی کے استشہاد کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ ان کے مطالعے کا بنیادی اور شاید اہم ترین موضوع وہ تصورات تھے۔ جن سے اقبال حکیم الامت کے درجے کو پہنچے اور جن کی توضیح و تعبیر و تشریح و تفہیم کا فریضہ آنے والے ادوار نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ چنانچہ مولانا صلاح الدین احمد کی حیثیت اقبال کے حیات شناس کی نہیں، بلکہ وہ ایک ایسے رمز شناس تھے جنہوں نے نہ صرف عہدِ اقبال کا مطالعہ کیا تھا، بلکہ اپنی زندگی کے اولیں ۳۵ سال بھی اُس عہد ہی میں بسر کئے تھے اور ان قومی تحریکوں میں بھی حصہ لیا تھا جن کی جہت سازی میں الطاف حسین حالی، محمد علی جوہر، شبلی نعمانی، ظفر علی خان اور اقبال شریک رہ چکے تھے۔ انہوں نے اُس اقبال سے زیادہ موانست پیدا کی، جو ایک دانائے راز ایک مفکر اور ایک عارف کا مقدر لے کر آئے تھے اور اپنی خلوت نشینی اور عافیت پسندی کے باوجود عشق فقر اور ایمان کی تعبیر نو سے انسانیت کو اُلوہیت کے قریب لانے میں کوشاں تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کے ایک اہم تصور کو مملکت کی صورت میں مجسم ہوتے بھی دیکھا تھا اور اس سیاسی کشمکش کا مطالعہ بھی کیا تھا جو اس مملکت کو ظہور میں لانے کے لئے برصغیر کی بساطِ سیاست پر عمل میں لائی جا رہی تھی اور جس کی قیادت قوم نے حضرت قائد اعظم کو تفویض کر رکھی تھی۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اپنی زندگی کے آخری پچیس سال پاکستان کی آزاد فضا میں گزارے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ہر سال جب یوم اقبال کے جلسوں سے ان کی آواز ابھرتی تو وہ بھرائی ہوئی ہوتی اور وہ بادیدۂ نم کہتے کہ

"معاشرت میں آزادہ روی، بلند فطری، جفا کوشی اور اکلِ حلال کے جو بلند تصورات اقبال نے اپنے الہامی کلام کے آخری دور میں اپنی قوم کو عطا کئے، قوم نے ان کی یہ قدر کی کہ اس کی مثالی مملکت پر اقتدار پاتے ہی انہیں پارہ پارہ کر دیا ------[4]

آج اگر کسی معجزے سے اقبال زندہ ہو جائے تو کرگسوں کی اس قوم کو ہرگز نہ پہچان سکے گا جو غیر کے مال متروکہ پر تصرف کے لئے ہر وقت آپس کی چھینا جھپٹی میں مبتلا ہے اور جو ادنیٰ اسباب دنیا کو معبود بنا کر ذلت و مسکنت کی پستیوں میں گرتی چلی جا رہی ہے اور پھر اپنے آپ کو بڑے ذوق و شوق سے مومن بھی کہلواتی ہے"[5]

وہ قو ... سے سوال کرتے کہ

"آج ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو حصولِ رزق میں شاہین کی بجائے کرگس کو اپنا رہنما نہیں بناتے؟ کتنے ہیں جو مراعات و وظائف کے حصول اور جائیدادِ متروکہ کی تحصیل میں اپنی زندگی کی کامرانیاں تلاش نہیں کرتے اور کتنے ہیں جو فقر، محنت، ایمان، غیرت اور جفاکشی کے مسلک پر مہذب گداگری اور مفت خوری کی زندگی کو ترجیح نہیں دیتے؟ اور یہیں تک بس نہیں، آج قومی پیمانے پر بھی غیروں کی بے تحاشا امداد لئے جاتے ہیں اور ہمارے چہروں پر حیا کی ہلکی سی سرخی بھی نہیں آتی۔ کیونکہ وہ مردِ قلندر ہم میں سے بہت جلد اُٹھ گیا، جس نے جاتے جاتے کہہ دیا تھا ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی[۲]

مولانا صلاح الدین احمد کے مطالعۂ اقبال کا ایک یہ پہلو بھی اہم ہے کہ جب قوم فقر کشی کے عمل میں مبتلا ہو کر مادی بوجھ کے نیچے دب کر رہنے لگی تو انہوں نے تصوراتِ اقبال کی تازگی اور توانائی سے قوم کو بھولا ہُوا سبق یاد دلانے اور اسے گم شدہ صراطِ مستقیم دوبارہ اختیار کی ترغیب دی اور لاہور جیسے شہر بے مثال سے اعلائے کلمۃ الاقبال کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد اپنی ذاتی حیثیت میں ہمیں ایک قومی مصلح نظر آتے ہیں، لیکن اس حیثیت میں بھی ان کے مرشد اقبال ہی ہیں اور مولانا نے اپنی ذات کو نمایاں کئے بغیر اپنے مرشد ہی کا پیغام قوم تک پہنچانے کی سعی کی اور کلامِ اقبال کی ان معنوی خوبیوں کو آشکار کیا ہے جنہیں بار بار نشر کرنا وہ اپنا فرض تصوّر کرتے تھے۔

تصوراتِ اقبال میں سے مولانا صلاح الدین احمد نے مردِ مومن، انسانِ کامل، نظریۂ خودی، تصورِ فقر، تصورِ معاشرت و معیشت، تصورِ شاہین، تصورِ عشق کو اساسی اہمیت دی ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ یہ سب موضوعات ایسے ہیں۔ جن پر صلاح الدین احمد کے علاوہ دوسرے درجنوں مصنفوں اور مضمون نگاروں نے قلم اٹھایا ہے اور بحثیں کی ہیں۔ لیکن مولانا صلاح الدین احمد کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کو خالصتہً ایک پاکستانی مدبر کی حیثیت میں قبول کیا اور ایک محبِّ وطن نقّاد کی صورت میں ان کی معنوی تعبیریں پیش کیں۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے ہر موضوع کو ملّی زندگی اور قومی تحریکوں کے مناظر میں پرکھنے کی کوشش کی اور نہ صرف موضوع کی لطافتیں آشکار کیں بلکہ اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اقبال کے آخری دَور کی الہامی شاعری میں ان کا رُوئے سخن تمام تر اس قوم کی طرف تھا، جس کے وطن کے جغرافیائی خدوخال ۱۹۳۸ء تک غیر منقّش تھے، لیکن جس کی تشکیل کو اقبال نے اپنی

روحانی آنکھ سے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ مولانا صلاح الدین احمد نے مطالعاتِ اقبال سے اقبال کے تصوّرات کی توضیح ہی نہیں کی بلکہ قوم کو حقیقی اقبال سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے مطالعات کا مناظر قومی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی، لیکن ان کا مرکزِ توجہ پاکستانی قوم ہے۔ جس کی زبوں حالی کا مرثیہ الطاف حسین حالی نے سقوطِ دہلی کے بعد لکھا تھا اور اب مولانا صلاح الدین احمد اس قوم کو آزادی کے بعد مادے کے اس ملبے سے نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے جو قوم نے آزادی کے بعد اپنے اوپر ڈال لیا تھا، حصولِ مقصد کے لئے افکارِ اقبال کی تبلیغ مولانا نے دل کشا انداز میں کی اور کلامِ اقبال سے ایک کار آمد نسخے کا کام لیا۔

مولانا صلاح الدین احمد کے اقبالیاتی مطالعے میں سب سے پہلے اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ انہوں نے اقبال کو صرف شاعر کے طور پر قبول نہیں کیا، بلکہ انہوں نے اقبال کو ایک مفکر اور ایک قومی راہنما کی حیثیت دی اور انہیں دانائے راز کے طور پر قبول کیا۔ "اقبال کو تہذیبی اور سیاسی عوامل کی ایک معجزانہ مخلوق" شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

"غالب کو ان کے گرد و پیش نے غالب بنایا تھا اور اقبال کو ان کے سیاسی ماحول نے اقبال مند کیا"۔[۳۵]

ایک دانائے راز کی حیثیت میں مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کی سیاسی ماحول میں پروان چڑھنے والی اقبال مندی کو اہمیت نہیں دی، بلکہ ان کے فکرِ بلیغ کے معرکہ آرا، عروج کا راز ان کی خلوت نشینی میں تلاش کیا اور انہیں ایک ایسے ناظر کی حیثیت دی جو خود شریکِ دغا نہیں ہوتا لیکن ایک بلند ٹیلے پر بیٹھا سارے کارزار کا نقشہ دیکھتا رہتا ہے۔ ہمارے کارزارِ حیات کا غائر مطالعہ کرتا ہے اور ہمیں اپنے ارتقاء سے فکر کی ہر منزل پر مستفید ہونے کا موقع عطا کرتا ہے۔ اقبال کی حیثیت اس دور کے دوسرے ممتاز رہنماؤں سے مختلف تھی۔ وہ پیدا ہوئے تو سر سید احمد خان "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر قوم کو فلاح کی نئی راہ دکھا چکے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے فکرِ اقبال کے پس منظر کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"سر سید کو وقت کا اصرار اور تاریخ کا تقاضا ایک بھٹکی ہوئی قوم کی راہبری کیلئے کشاں کشاں جادۂ حیات پر لے آیا تھا۔ سر سید نے قوم کو جو منصوبۂ عمل دیا، اُس نے زوال کی ڈھلان پر پھسلتی ہوئی قوم کے قدموں کو فوراً استقامت بخشی اور اس کا رُخ یکسر بدل کر زندگی کی ایک نئی منزل اور کامیابی کے ایک نئے تصوّر کی طرف پھیر دیا۔

Iqbal Cyber Library
All rights reserved
© 2002-2006

سر سیّد نے ہمیں قومی تعمیر کے اس جدید تصوّر سے آشنا کر کے در حقیقت اپنا مشن پورا کر دیا تھا۔"[۴۸]

لیکن بیسویں صدی میں جب قومی تحریکوں کا رُخ عملی سیاست نے تبدیل کر دیا تو سر سیّد کا بنا کردہ قومی تعمیر کا تصوّر کچھ زیادہ کار آمد نہ رہا، ان کے اس تصوّر کو اگرچہ حالی نے "سنگ و خشت سے پائندہ اور رنگ و روغن سے آراستہ کیا اور اپنے مخصوص دھیمے اور منطقی انداز میں ہمیں اپنی دینوی بدحالی کی طرف متوجہ کیا اور پھر ہمیں اس منصوبے کی حدود میں پابند کر کے ہمارے لئے دینوی فلاح کا وہی علاج تجویز کیا جس کا نسخہ سر سیّد نے بتایا تھا"۔ مولانا صلاح الدّین احمد نے سر سیّد اور حالی کے اس طریق عمل سے اختلاف نہیں کیا، بلکہ ان کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی مقتضیات غالباً تھیں بھی اسی قدر۔ ہم زندگی کا ایک نیا اسلوب اختیار کر رہے تھے۔ دینوی زندگی میں ہمارے برادرانِ وطن ہم سے گوئے سبقت لئے جا رہے تھے۔ اطرافِ عالم میں وہ امن قائم تھا، جو بنیادی کام کرنے والوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لازم تھا کہ ہم اپنی ساری توجّہ اپنی اساسی تعمیر پر مذکور رکھیں اور اُوپر آنکھیں اُٹھانے سے پہلے زمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیں۔"[۴۹]

لیکن وہ سر سیّد تحریک کے سب ثمرات کو شیریں قرار نہیں دیتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سر سیّد نے اپنی حکمتِ عملی سے مسلمان کو جو انگریز کا ہزیمت خوردہ دشمن سمجھا جاتا تھا، انگریز ہی کا یارِ وفادار اور خیر خواہ بنا دیا، لیکن مولانا صلاح الدّین احمد اس ردِّعمل سے بھی آشنا تھے جو ہماری قومی زندگی کے روحانی اور جذباتی پہلو پر چھا رہا تھا۔ انہوں نے ملک کی عصبیت اور گوکھلے کی مآل اندیشی کے سائے میں پرورش پانے والی ہندوستانی نیشنلزم کی تحریک کا مطالبہ بھی کیا اور اسلامیانِ ہند کے اس احساس میں بھی شرکت کی۔ جسے طرابلس اور بلقان میں یورپ اور اسلام کی آویزش نے پیدا کیا تھا۔ محمد علی جوہر، ظفر علی خان اور حسرت موہانی اس دَور کے ادیب بھی تھے اور قومی راہنما بھی، لیکن جب یہ عملی سیاست میں آئے تو عتابِ فرنگ کا شکار بھی ہوئے۔ اقبال اس دَور کی عملی سیاست میں شریک نہیں تھے، لیکن ان کی راہنمائی دوسرے راہنماؤں سے کم اہم نہیں تھی۔ مولانا صلاح الدّین احمد نے اس دَور کے مسلمان راہنماؤں میں سے اقبال کی منفرد حیثیت ایک بالکل انوکھے زاویے سے متعین کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

"اقبال ہمارے سامنے دینوی فارغ البالی یا اقتصادی خوش حالی کا تصور پیش نہیں کرتا نہ ہی وہ ہمیں کسی سیاسی منفعت یا ہنگامی کامرانی کی طرف بلاتا ہے بلکہ وہ ہم میں سے ہر فرد کے سامنے ایک ایسا روحانی اور ایمانی نصب العین رکھ دیتا ہے جو اس کے نزدیک مردِ مومن کی میراث ہے اور زمین پر خلافتِ الٰہی کا نشان ہے۔ اس کی پیش کردہ قدریں زمانے کی کروٹوں سے بدلتی نہیں بلکہ مرورِ ایام پر خندہ زن رہتی ہیں اور خود زمانہ اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالتا اور درست کرتا چلا جاتا ہے۔"[۱۱]

بالفاظ دیگر سرسید نے دینوی فارغ البالی کی راہ ہموار کی، حالی نے کھیتوں کو بہتی گنگا سے بروقت پانی پینے کا سبق دیا، محمد علی جوہر نے ہندوستان کے غلام مسلمانوں کو بین الاسلامی سیاست میں شامل ہونے کی ترغیب دی اور بقول مولانا صلاح الدین احمد "بھول بھلیوں میں اپنی راہ بھی گم کر لی" لیکن:

"اقبال کی بلند نظری، بے تکلف، ان احوال و مقامات تک پہنچ گئی جو فرد اور قوم دونوں کی دائمی اقدار اور دونوں کے حقیقی عروج و زوال سے نسبت رکھتے ہیں۔"[۱۲]

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس دور میں محمد علی جناح بھی ہندوستانی سیاست میں شریک ہو چکے تھے اور بقول مولانا صلاح الدین احمد اقبال کی طرح وہ بھی اس عرصے میں پیدا ہونے والے مد و جزر کے خاموش ناظر تھے۔ ان دو قومی راہنماؤں کی نظارت کی نوعیت میں فرق کرنا مشکل نہیں تھا۔ صلاح الدین احمد نے خیال ظاہر کیا ہے کہ:

"اس دور میں محمد علی جناح ہندوستانی سیاست کے تجربوں سے اپنے سیاسی تفکر کی تعمیر کر رہے تھے اور اقبال کا روحانی اور الہامی تفکر اسے فرد کی ممکنات اور مردِ مومن کے مقامات سے آشنا کرا رہا تھا۔"[۱۳]

مسلمانوں کی اس قیادت کے عناصرِ خمسہ یعنی سرسید، حالی، محمد علی جوہر، اقبال اور محمد علی جناح کے تقابلی جائزے سے مولانا صلاح الدین احمد نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

"اقبال کا عرصۂ فکر اس کے شعری اور فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے اسلامیانِ ہند کے دوسرے رہبروں کی تخیلی وسعتوں سے بدرجۂ غایت وسیع تر تھا اور اس کی نظر اپنے معاصر رہنماؤں کی نظر سے بے اندازہ بلند تر تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلامیانِ ہند ایک شدید کشمکش کے بعد ایک قومیت کے سانچے میں ڈھل چکے تھے اور اب ایک بڑی حد تک اپنے تمدن کی صورتیں اور حدود بھی متعین کر چکے تھے اور اس وقت

وہ ایک ایسی راہنمائی کے منتظر تھے جو ان کے حقیقی مسائل کی گہرائی تک پہنچے اور انہیں زندگی کا ایک پائندہ پیغام دے۔ یہ راہنمائی انہیں تعلیماتِ اقبال کی حیات افروز کیفیتوں میں ملی اور فرد کے ذریعے سے قوم کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔"[۳۱]

متذکرہ بالا بحث کی روشنی میں مطالعۂ اقبالیات میں مولانا صلاح الدین احمد کی بنیادی عطا یہ ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے اوّلین چار عشروں میں مسلمانوں کی قیادت کی جو کیفیات دریافت کیں، ان میں اقبال کا مقام بطور ایک مفکر رہنما کے متعین کیا اور اس راہ کی نشاندہی کی، جسے قائدِ اعظم جیسے عملی سیاست دان نے کامرانی کی منزل تک پہنچایا۔ چنانچہ قائدِ اعظم کے عمل اور اقبال کے فکر کا نقطۂ انضمام ایک ہی ہے، اور وہ پاکستانی قوم ہے۔ اقبال نے اس قوم کی حیاتِ اجتماعیہ کو قرآن و سنت پر عمل سے مشروط کیا اور اس کا روحانی ناتا مولانا رومؒ اور حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے ساتھ قائم کیا اور یہ حقیقت بے حد دلچسپ ہے کہ سرسیّد کی جدیدیت کی تحریک سے واضح اختلاف نہ کرنے کے باوجود افکارِ اقبال پر سرسیّد کا پرتو نظر نہیں آتا اور وہ فرد کو دنیاوی فتوحات کی طرف پیش قدمی کا کوئی سبق نہیں دیتے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کی اس روحانی کیفیّت کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"قوموں کے عروج و زوال کا ایک وسیع پس منظر اقبال کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جن اقوام نے اپنے اپنے عہد میں غلبۂ ارضی حاصل کیا، بیشتر صورتوں میں ان کے افراد کی تعداد مختصر اور ان کے ذرائع محدود تھے۔ اس کے باوجود اگر وہ قومیں کامرانی سے ہمکنار ہوئیں تو یہ ان کے افراد کی غیر معمولی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔ یونان اور روما، فرنگ اور عجم، فرانسیسی اور المانی اپنے اپنے وقت پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور دنیوی کامیابی کے مقاماتِ اعلےٰ تک جا پہنچے، اور اگرچہ بدیہی طور پر ان کی یہ فتوحات اور کامرانیاں ان کے افراد ہی کی ہمتوں اور سخت کوششوں کا ثمرہ تھیں، لیکن ان کی کیفیتیں سراسر مادی اور ان کے مقاصد بیشتر پست اور بہیمانہ تھے۔"[۳۲]

ان کے برعکس اقبال کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ:

"اقبال کے ضمیر میں مردِ مومن ابھرتا ہے، اور وہ اپنے مخاطب کے سامنے کامرانی اور سربلندی کا وہ تصوّر پیش کرتا ہے، جو درحقیقت فوزِ عظیم ہے اور جسے تقدیرِ الٰہی نے مومن کی میراث قرار دیا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن انسانیت کا اکمل نمونہ اور اُن

تمام خصائص سے متصف ہے جو تسخیرِ عالم کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے وہ دولت بھی ارزانی ہوئی ہے جسے فقر کہا گیا ہے، اور وہ سیر چشمی بھی ملتی ہے جو سلطانی و درویشی کے امتزاج سے عبارت ہے۔ وہ دنیا کو مسخر کرتا ہے کہ اس میں خداوندِ قدّوس کی بادشاہت قائم کرے اور بنی نوعِ انسان کو ایک امنِ دوام اور راحت لازوال کی نوید دے۔"[۱۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اقبال نے جن قدروں کے فروغ کی سعی کی، وہ کسی خاص خطّے کے لوگوں کی ذہنی، روحانی اور دینوی بہبود ہی میں معاونت نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کا اثر و عمل عالمگیر اور زمانی اعتبار سے بے کراں تھا۔ اقبال نے جن تین تصوّرات کی تشکیلِ جدید کی، ان میں خودی، فقر اور عشق سب سے اہم ہیں اور ان کے اثر و عمل کا دائرہ بھی بے کراں ہے اور مولانا صلاح الدین احمد اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے؛ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ

"اقبال کی تعلیمات کی بنیاد تہذیب و تربیتِ انسانی کا اسلامی تصوّر ہے، مگر یہ اس کی وسیع تر بنیاد ہے۔ اس پر اقبال کے فکر نے ایک بے مثال عمارت تعمیر کی جس کی رفعت آج اقصائے عالم کی تعمیرات پر خندہ زن ہے۔ اس کی بلندی اور عظمت کی اقدار مادّی نہیں بلکہ سراسر روحانی ہیں اور اسی لئے اس فوزِ عالی سے قریب ترین ہیں جو انسانیت کا مقصودِ آخر ہے۔"[۱۶]

اقبال کے پیغام اور ان کی تعلیمات کی عالمگیریت کو تسلیم کرنے کے باوجود مولانا صلاح الدین احمد نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ

"اقبال کا خطاب فطرتاً اس خطۂ ارض کے باشندوں سے ہے، جسے خود اس کے زادِ بوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔"[۱۷]

یہاں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اقبال نے اپنے تاریخی خطبے میں مسلمانوں کو برِّصغیر کے شمال مغربی کونے میں ایک قومی وطن کی تاسیس کی دعوت دی تھی؛ چنانچہ اس سے یہ خدشہ یقیناً پیدا ہوتا ہے کہ شاعر آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں سے اُتر کر زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کی حدود میں ملّت اور اس کے مفاد کو محصور و محدود کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد بھی اِس خدشے سے آشنا تھے؛ چنانچہ انہوں نے اس حقیقت کو آشکار کرنے کی سعی بھی کی ہے جس کے تحت اقبال ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے اور اُسے مسلمانوں کا مرکز و محور بنانے پر آمادہ ہو

گئے تھے۔ سیاسی عوامل سے قطع نظر مولانا صلاح الدین احمد نے تجزیہ کیا کہ

"اقبال کی حکمت نے، مدت ہوئی، یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ارضِ مشرق کی آئندہ رہبری اس چھوٹی سی قوم کے حصے میں آئے گی جو ہندوستان کی کہنگی کے باوجود اب تک تازہ دم ہے اور جس نے تاریخ میں اپنے لیے اب تک کوئی مقام حاصل نہیں کیا۔ وہ ازمنۂ قدیم سے دوسروں کی لڑائیاں لڑتی اور دوسروں کے معرکے سر کرتی رہی ہے لیکن اُسے خود اپنی سیرت کے ارتقاء اور اپنی منازل کے استحکام کا اب تک کوئی موقع نہیں ملا۔ اس کی بصیرت نے اس پر یہ حقیقت آشکار کر دی تھی کہ عنقریب اس کے اہلِ وطن کو اپنے قومی نشوونما و ارتقاء کا ایک بے نظیر موقع ملے گا، اور اگر انہوں نے اس فرصت سے پورا فائدہ نہ اٹھایا تو پھر شاید حشر تک انہیں کوئی اور فرصت نہ مل سکے۔"[۱۸]

دوسری طرف انہوں نے زمین کی اہمیت کا احساس بھی دلایا اور ایک مخصوص خطے کو جسے ہم اپنا وطن کہہ سکیں، تعلیماتِ اسلام اور تصوراتِ اقبال کے فروغ کا مرکز بنانے کی ضرورت بھی محسوس کی۔ مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں کہ

وہ زمین آخر زمین ہے اور ہمارے تخیل کی ہزار پرواز یں اور ہماری آرزو کی ہزار رفعتیں بھی اسے آسمان نہیں بنا سکتیں، اور حقیقت کی دنیا میں ہمیں آسمان سے بہت زیادہ ضرورت بھی زمین ہی کی ہے تاکہ آسمان کی بادشاہت زمین پر قائم ہو اور اللہ کی اس زمین پر اس کے فرماں بردار بندے اس سے متصرف ہو کر اسے اپنا وطن بنائیں اور اس وطن کی حفاظت میں اگر ضرورت پڑے تو اپنی جانیں اور اپنا مال اور اپنی اولاد قربان کر دیں۔ اقبال نے جب پاکستان کا تصور دیا تو یہ بلاشبہ اس کے آفاق گیر تصورِ ملت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس کی رجعت ایک حقیقت پرستانہ رجعت تھی۔ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو اپنے تحفظ اور اپنے فروغ کے تقاضے پورے کرنے کے لئے کسی بحرِ بے کراں یا کسی آسمانِ بے کراں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایک ایسے خطۂ زمین کی حاجت تھی جس میں سما کر یا سمٹ کر، پھیل کر، یا بٹ کر اسے ایک آزاد اسلامی زندگی بسر کرنی تھی۔"[۱۹]

چنانچہ مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کے تصورِ پاکستان کو تصورِ ملت سے علیحدہ یا وطن اور ملت کے مفاد کو متضاد نہیں سمجھا، بلکہ لکھا ہے کہ

"اب یہ مفاد ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور ایک کا فروغ دوسرے کی ترقی کا ضامن ہو چکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اب کہ ہم آزاد ہیں، ہم شاعرِ اسلام کی اس آواز کو بر لانے کے لئے ہمیشہ سربکف رہیں گے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر"[۲۰]

مولانا صلاح الدین احمد کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے تصورِ ملّت کو وطنیّت کے ساتھ ہم آہنگ قرار دیا اور قطرے کو تحفظِ وجود عطا کیا تو اسے ایک بڑے قلزم کا حصہ بھی شمار کیا اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ جزو غیر اہم نہیں اور ملّت کا ہر فرد اس کے مقدّر کا ستارا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اس نظام کو التفات کی نظر سے نہیں دیکھا، جس کی بنیاد دار و گیر کی حکمت پر رکھی گئی ہے اس کے برعکس انہوں نے فکرِ اقبال سے فرد کی اہمیّت کا پہلو تلاش کیا اور اسے مردِ مومن کے اوصاف اور الوہی صفات سے متصف ہو کر معاشرے کی نذر ہو جانے کی تلقین کی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ

"اقبال بندۂ ناچار کو بندۂ مولا صفات کا اعزاز عطا کرتا ہے۔ زمین اور آسمان کے خزانے اس کے تصرّف میں دیتا ہے، اور اس لیے دیتا ہے کہ وہ اللہ کا امین بن کر اللہ کی دولت کو انسانیت کی فلاح و نجات کے راستے میں صرف کر دے"[۲۱]

بظاہر فرد کی یہ مثالی صورت ہمیں کہیں نظر نہیں آتی لیکن صلاح الدین احمد بتاتے ہیں کہ

"اقبال کی نگہِ جویا دیوانہ وار مشرق و مغرب کی وسعتیں طے کرتی اور ناکام لوٹ آتی ہے لیکن آخر کار وہ تیرہ سو برس کا فاصلہ طے کر کے اس ذاتِ گرامی پر تصدّق ہو جاتی ہے جس کا نام بذل و ایثار کی تاریخ میں ابدالآباد تک روشن رہے گا اور انسانیت کے سامنے صرفِ دولت کا ایک مثالی معیار ہمیشہ قائم رکھے گا[۲۲] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال نے ہمیں انسانِ کامل کا تصوّر دیا ہے، خود ہی اس کی تمثیل بھی پیش کر دی، اور یہ تمثیل جناب سرورِ کائنات کی ذاتِ مبارک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاعرِ مشرق نے ایک عاشقِ صادق اور ایک دانائے راز کی دوگونہ حیثیت میں اس نورِ ہدیٰ سے اکتسابِ صداقت کیا جو مدّتِ مدید کے بعد کائنات کے افق پر ہویدا ہُوا تھا اور جسے ابد تک انسانیت کی رہبری مقدّر کی گئی تھی"[۲۳]

مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کو محض فکری اور نظریاتی زاویوں سے دریافت نہیں کیا بلکہ

ان کے فکر و نظر کے سرچشمے بھی دریافت کیے، اور مردِ مومن کی مثال کا مسئلہ پیدا ہوا تو مردِ کامل کی صفاتِ عالیہ کی تمثیلی صورت حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ ستودہ صفات میں تلاش کی اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ دیدہ ور جس کے انتظار میں نرگس ہزاروں سالوں تک روتی رہتی ہے، جب پیدا ہو جاتا ہے تو اقوامِ عالم کی تقدیر بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اس بندۂ مولا صفات ہی کے وسیلے سے اقبال کے تصورِ خودی، تصورِ فقر، تصورِ شاہین اور تصورِ مردِ مومن تک رسائی حاصل کی ہے اور انہیں ادراک و احساس کے نئے زاویوں سے روشن کر دیا ہے۔

مولانا نے اقبال کے تصورِ خودی کو نسلی برتری، ذاتی تفاخر اور خود پرستی کے احساسات سے الگ کرنے کی سعی کی اور عزتِ نفس کے حقیقی تصور کو عرفانِ خودی کی حدود میں لانے تو اُسے عظمتِ آدم کی شناخت کا دوسرا نام دیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ اقبال کا تصورِ عشق مومن کو تسخیرِ عالم کی دعوت دیتا ہے۔ حرکت اور حرارت، اس عشق کی دو بنیادی صفات ہیں۔ فقرِ دینوی محاصل سے بے نیازی کی دولت عطا کرتا ہے۔ اگرچہ فقر میں انکسار ہے لیکن یہ بعض اوقات تلوار کی صورت بھی اختیار کر جاتا ہے، اور تسخیرِ کائنات میں ایک فعّال قوت ثابت ہوتا ہے۔ خودی، عشق اور فقر جیسے موضوعات اقبال کی مطالعے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن خاصے مشکل ہیں۔ مولانا نے اپنی خلوت میں ان کا مطالعہ کیا اور حقیقت گرہ کشا ہوئی تو اُسے اپنی درماندہ قوم تک پہنچانے میں کوتاہی نہ کی۔ انہوں نے کلامِ اقبال سے لطف و سرور بھی حاصل کیا اور علم و حکمت کا اکتساب بھی کیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

"کوئی چالیس بیالیس برس کی بات ہے، مَیں اور میرے عزیز ترین دوست منصور احمد مرحوم ہر شام کنارِ راوی تک جاتے اور راستہ بھر کلامِ اقبال ہی موضوعِ سخن رہتا۔ انہی دنوں سُوءِ اتفاق سے ایک پڑھے لکھے ہندو نوجوان نے خودکشی کر لی۔ اس شام مَیں نے منصور احمد سے کہا کہ

کاش! پریم پرکاش، اقبال اور گفتۂ اقبال سے آشنا ہوتا۔ پھر وہ خودکشی کبھی نہ کرتا۔

آپ جانتے ہیں مرحوم نے اس کا کیا جواب دیا؟ کہنے لگے کہ مَیں اکثر اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ جن لاکھوں لوگوں کی زندگانی میں شعرِ اقبال کو دخل نہیں ہے، وہ زندہ کیوں ہیں اور خودکشی کیوں نہیں کر لیتے۔"[۲۴]

یہ چھوٹا سا واقعہ زندگی کو حقیقی زندگی بنانے کے لئے کلامِ اقبال کے مطالعے کی ضرورت اور فوقیت ظاہر

کرتا ہے۔ اپنے ایامِ جوانی میں کلامِ اقبال کا مطالعہ اور اس کے داخلی معانی اور پیغام تک رسائی صلاح الدین احمد کا وظیفۂ زندگی رہا۔ انہوں نے آرزو کی کہ "مطالعۂ پاکستان کا یہ ذوق وشوق ان کے دمِ آخر تک برقرار رہے"۔ مولانا کی یہ آرزو نہ صرف پوری ہوئی اور فکرِ اقبال کے ابلاغ و اشاعت کا سلسلہ انہوں نے اُدبی دُنیا میں اپنے سانحۂ ارتحال تک جاری رکھا بلکہ ان کی وفات کے بعد اس سلسلے کے تمام مضامین جو مولانا نے اپنی زندگی میں لکھے تھے "تصوراتِ اقبال" کے نام سے شائع کیے گئے اور اب یہ مضامین نہ صرف فکرِ اقبال کے بارے میں مولانا کی توضیحات کے مظہر ہیں بلکہ اس شیرینی و لطافت کو بھی قارئین کی نذر کرتے ہیں جو مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوب سے عبارت ہے، اور جس میں خود مولانا صلاح الدین احمد کی درویشی اور قلندری، ایثار اور استغنا، جلال اور جمال اور لطافت و جاذبیت کے علاوہ حرکت و حرارت بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ مولانا صلاح الدین احمد۔ مقالہ "اقبال کا تصورِ مملکت"، تصوراتِ اقبال ص ۲۴۔ المقبول پبلی کیشنز لاہور بار سوئم ۱۹۶۹ء۔ "تصوراتِ اقبال" مولانا کے ۲۳ بکھرے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین مختلف جلسوں میں پڑھے گئے اور بعد میں "ادبی دنیا" میں شائع ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی تدوین ان کے صاحبزادے معزّ الدین احمد نے کی اور انہیں ۱۹۶۵ء میں "صریرِ خامہ" کے سلسلے کی پہلی جلد کے طور پر شائع کیا۔ اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے۔ زیرِ نظر اس کا تیسرا ایڈیشن ہے۔

۲۔ مقالہ "پیغامِ اقبال" حوالہ ایضاً ص ۲۷۳

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ مقدمہ "تصوراتِ اقبال" ص ۲

۴۔ مقالہ "اقبال کا تصورِ معاشرت"، حوالہ ایضاً ص ۹۴

۵۔ مقالہ "اقبال کا تصورِ فقر" حوالہ ایضاً ص ۵۹

۶۔ مقالہ "اقبال کا تصورِ معاشرت"۔ حوالہ ایضاً ص ۹۴

۷۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ مقدمہ۔ حوالہ ایضاً ص ۴

۸۔ مقالہ "دانائے راز" حوالہ ایضاً ص ۳۶۳

۹ ایضاً ص ۳۶۳

۱۰ مقالہ "اقبال کا مردِ مومن" ص ۱۳۸

۱۱ ایضاً ص ۱۳۷

۱۲ محمد علی جناح اِس وقت قائدِ اعظم کی اضافت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔

۱۳ مقالہ "اقبال کا مردِ مومن" ص ۱۳۵

۱۴ ایضاً ص ۱۳۷

۱۵ ایضاً ص ۱۳۹

۱۶ ایضاً ص ۱۴۶-۱۴۵

۱۷-۱۸ ایضاً ص ۱۴۶

۱۹ مقالہ "پھر وطنیت کی طرف" ص ۳۲۹

۲۰ ایضاً ص ۳۳۲

۲۱ مقالہ "اقبال کا تصورِ معیشت" ص ۷۶۵

۲۲ ایضاً ص ۷۶۶

۲۳ مقالہ "اقبال کا انسانِ کامل" ص ۱۶۸

۲۴ "اقبال کے دس شعر" ص ۳۰۲

---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

علامہ اقبال ورلڈ مسلم کانفرنس کے ارکان کے ساتھ یروشلم میں